مشہور یادگاریں

ماہر القادری

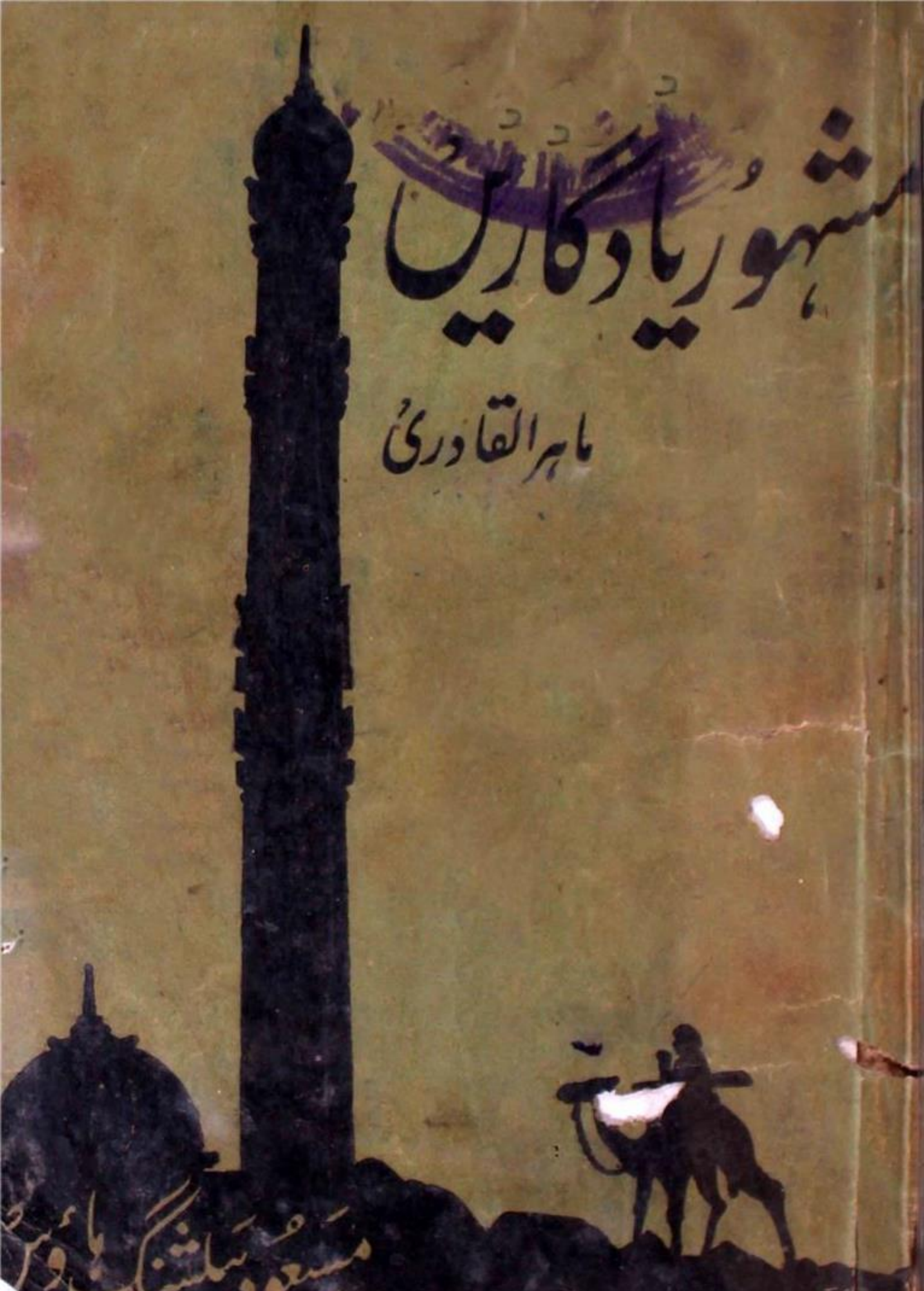

مسعود پبلشنگ ہاؤس

جملہ حقوق دائمی بحق (چودھری) محمد اقبال سلیم گاہندری محفوظ ہیں

مشہور یادگاریں

قطب مینار دلّی کی جامع مسجد
لال قلعہ تاج محل

از

ماہر القادری

مسعود پبلشنگ ہاؤس
عابد روڈ۔ حیدرآباد (دکن)

قیمت۔ آٹھ آنہ سکہ عثمانیہ
قیمت سات آنہ سکہ کلدار

قطب مینار

ناصر:- ارے بھئی! بنے میاں! یہ آج دِلی کے لوگ تانگوں میں بیٹھ کر کہاں جا رہے ہیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ذرا سی دیر میں کوئی آٹھ دس تانگے میرے سامنے سے گزر چکے ہیں۔

بنے میاں:- دیکھتے نہیں ہو، کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، رم جھم رِم جھم ہو رہی ہے۔

ناصر:- یار تم تو سدا ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہو جیسے کوئی پہیلی بوجھ رہا ہے، میں نے پوچھا کچھ تھا اور تم نے جواب کچھ اور دیا

بنے میاں :- ناصر! تمھارا حال تو بس اُس گنوار جیسا ہے جس نے کہا تھا کہ عقل سے بھینس بڑی ہے کہ اُس کا دُودھ پینے کو ملتا ہے - میاں! دلّی کے لوگ چھینٹا پڑتے ہی سیر سپاٹے کے لیئے باہر نکل جاتے ہیں -

ناصر:- تو یہ سیر کرنے والے بستی چھوڑکر جنگل کی طرف جارہے ہیں -

بنے میاں :- ہاں! راستے میں جنگل بھی پڑے گا مگر یہ لوگ مہرولی جارہے ہیں وہاں جاکر گھومیں پھریں گے پکوان ہوگا، گرم گرم پوری کچوری کھائیں گے اور قطب مینار پر چڑھ کر خوب سیر کریں گے -

ناصر:- اچھا تو یہ قطب مینار مہرولی میں ہے -

بنے میاں :- تم نے آج تک قطب مینار بھی نہیں دیکھا بھلے آدمی!

ناصر:- میر صاحب کے چھوٹے بیٹے اعظم کی

طرح میں شیخی باز اور جھوٹا نہیں ہوں — ! ہاں!
بھائی! قطب مینار دیکھنے کا آج تک اتفاق نہیں ہوا۔

بنے میاں :- یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بارہ برس دلّی میں رہے اور بھاڑ جھونکا کیئے! چلو مہرولی چلیں، رُت بھی سُہانی ہے، اسکول کی چھٹی بھی ہے اور آج اتفاق سے بندے کی جیب بھی گرم ہے

ناصر:- ہاں! میں تیار ہوں۔ مگر بنے! جاتے جاتے گھر سے برساتی اور چھتریاں لے لیں، ابھی تو ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں لیکن بادلوں کا انداز بتا رہا ہے کہ دھواں دھار مینھ برس کر رہے گا۔

بنے میاں :- پھر وہی بے تکی باتیں! ہم دونوں آٹے کے بنے ہوئے نہیں ہیں جو پانی پڑتے ہی گھُل جائیں گے، برسات کا لطف تو بھیگنے اور شرابور ہونے ہی میں ہے۔

دونوں دوست خوشی خوشی تانگوں کے اڈّے پر

پہونچے، تانگے والے "مہرولی، قطب اور نظام الدین" کی آوازیں لگا رہے تھے۔ ببّنے میاں نے ایک تانگے والے سے پوچھا تو وہ بولا کہ پورے تانگہ کا کرایہ یہاں سے مہرولی تک آنے جانے کا سات روپیہ ہوگا۔ ببّنے میاں سات روپیوں کا نام سن کر آگے بڑھنے لگا تو تانگہ والے نے کہا۔ ہجور! ایک نمبر فسٹ کلاس تانگہ ہے میرا، لگام کو جھٹکا لگتے ہی گھوڑا ہوا سے باتیں کرے گا۔ اس سے زیادہ آرام کا تانگہ اور تیز گھوڑا، قاضی حوض سے لے کر کشمیری دروازے تک نہیں مل سکتا۔

ناصر نے ببّنے سے کہا کہ بھئی! نئی دہلی کو موٹر بسیں بھی تو جاتی ہیں، کوئی بس تمھاری مہرولی بھی ضرور جاتی ہوگی۔ ببّنے میاں اس پر بولا۔ یار! بعض وقت تم بڑی عقل کی بات

کہہ جاتے ہو' تانگوں کے چکر میں پڑنا بے کار ہے چلو! موٹر بس میں بیٹھ کر چلیں۔

ناصر اور بنّے میاں موٹر بس کے انتظار میں کھڑے رہے' ایک بس آکر رُکی تو بہت بھری ہوئی تھی' پائدان پر آدمی لٹکے ہوئے تھے' ناصر نے چڑھنا چاہا بنّے میاں نے ہاتھ پکڑ کر روک دیا کہ ہم سیر و تفریح کے لیئے گھر سے آئے ہیں چوٹ کھانے اور جان دینے کے لئے نہیں آئے' اِس طرح بھیڑ بھاڑ میں گرنے کا اندیشہ ہے۔ ناصر نے اس پر کہا کہ یہ اور لوگ جو لٹکے جا رہے ہیں' بنّے میاں نے جواب دیا۔ دریا میں ڈوبتوں کو دیکھ کر خود بھی ڈوب جانا حماقت اور بے وقوفی ہے' کسی کی غلطی کی ریس اور نقل نہیں کرنی چاہیئے۔

تھوڑی دیر بعد دوسری بس آگئی' دونوں دوست اُس میں سوار ہوئے اور موٹر بس روانہ

ہوگئی بنّے تو کئی بار مہرولی جا چکا تھا، ناصر کا یہ پہلا موقع تھا اس لیئے وہ بہت خوش تھا کہ اتنی مشہور اور تاریخی عمارت دیکھنے کو ملے گی، ناصر خوشی میں آکر ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگا، اُس نے اپنے دوست سے کہا۔ بنے میاں! میں جی ہی جی میں خدا سے دعا کر رہا ہوں کہ بنّے میاں کہیں کے راجہ ہو جائیں! اس پر بنے میاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں راجہ ہوگیا تو گدی پر بیٹھتے ہی گھوڑوں کے اصطبل کا تمھیں داروغہ بنا دوں گا، ناصر نے قہقہہ لگایا اور دوسرے مسافر بھی ہنسنے لگے۔

موٹر بس کئی جگہ رُکتی رُکاتی قطب پہنچی دونوں دوست اُترے اور تھوڑی دور پیدل چل کر قطب مینار پہنچ گئے۔ یہاں سیر کرنے والوں کی بھیڑ لگی تھی، چھوٹے بچوں سے لے کر بُرقعہ والی عورتیں تک

گھوم رہی تھیں، آدمی کے دم کی بڑی رونق ہے، چٹیل میدان اور سنسان بیابان میں آدمی چلے جائیں تو جنگل میں منگل کا مزہ آجاتا ہے اور سونے چاندی کے بنے ہوئے محلوں میں آدمی نہ ہوں تو محل کھنڈروں سے بدتر نظر آتے ہیں۔

بنّے میاں! یہ قطب مینار ہے، قطب مینار! آسمان سے باتیں کررہی ہے اس کی چوٹی، یہ لو! میری تو ٹوپی سر سے گر پڑی ——— ناصر نے خوش ہوکر اوپر دیکھتے ہوئے کہا اور دونوں دوست مینار کے دروازے میں داخل ہوکر اوپر چڑھنے لگے، ناصر پتلا دُبلا اور بنّے میاں بھاری بھرکم تھا، تھوڑی دور چڑھ کر بنے میاں کی سانس پھول گئی اور بنّے میاں کے ساتھ ناصر بھی سستانے کے لیئے ٹھہر گیا، راستہ میں ٹھہرتے ٹھہراتے دونوں دوست قطب مینار کی چوٹی پر پہنچ گئے۔

ناصر:۔ (نیچے دیکھتے ہوئے) ارے! نیچے کھڑے ہوئے آدمی بالکل بالشتیے دکھائی دیتے ہیں اور وہ دیکھو خونچے والے کا تھال، رکابی کی طرح چھوٹا معلوم ہوتا ہے، دُنیا کے پردے پر اس سے اونچی کوئی عمارت کاہے کو ہوگی

بنّے میاں:۔ یہ مینارہ پہلے اس سے بھی اونچا تھا، سات کھنڈ تھے! اس کے! دو گر گئے اور اب پانچ حصے باقی رہ گئے ہیں۔

ناصر:۔ اور سیڑھیاں تو بے شمار ہیں اس میں!

بنّے میاں:۔ بے شمار تو نہیں ہیں، تین سَو اٹھتر ۳۷۸ سیڑھیاں بتائی جاتی ہیں۔

بہت دیر تک دونوں قطب مینار کی چوٹی سے دُور دُور کی سیر کرتے رہے اور جب طبیعت بھر گئی تو نیچے اُتر آئے اور سُستانے کے لیئے پاس کی بارہ دری میں بیٹھ گئے۔

ناصر میاں :۔ قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا اس لاٹھ کو؟

بنے میاں :۔ بھئی! اس مینار کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں، کوئی کہتا ہے کہ دلّی کے راجہ رائے پتھورا نے جمنا ندی کے درشن کرنے کے لیئے اس لاٹھ کا پہلا کھنڈ بنایا تھا، کسی کا بیان ہے کہ سُلطان شمس الدین التمش اس کا بانی ہے اور بعض تاریخوں میں اُسے سُلطان معزالدین کی لاٹھ لکھا ہے۔

ناصر میاں :۔ خیر! جس نے بھی یہ عمارت بنائی ہے خوب بنائی ہے، کیسا پائدار مسالہ لگا ہے کہ پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ ایک یہ انگریز کی بنوائی ہوئی نئی دہلی کی عمارتیں ہیں کہ ادھر عمارت بنی جاتی ہے اور اُدھر مرمت ہوتی جاتی ہے۔

ناصر اور بنے میاں تھوڑی دیر اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے،

پھر ہوٹل میں جاکر چائے پی اور موٹر بس میں بیٹھ کر شہر چلے آئے۔ ناصر نے بنّے کا شکریہ ادا کیا کہ بھئی! آج تمھاری بدولت قطب کی لاٹھ میں نے دیکھ لی اور سیر و تفریح سے طبیعت بہل گئی۔ بنّے میاں نے کہا کہ آؤ جامع مسجد چل کر ملائی کی قفلیاں کھائے چلیں، ناصر نے جواب دیا۔ بھئی! برسات کا زمانہ ہے ابھی قطب میں سنبوسے کھاکر چائے پی چکے ہیں بار بار کھانا ٹھیک نہیں، اس پر بنّے میاں نے مسکرا کر کہا۔ ناصر! تم تو قطب مینار دیکھتے ہی عقل مند ہو گئے، دو چار بار اور وہاں ہو آئے تو اپنے زمانہ کے افلاطون ہو جاؤ گے ——— ناصر مسکرانے لگا۔

دہلی کی جامع مسجد

حمیدہ :- آپا ! تم دلّی کی سیر کر آئیں - مُبارک ! اسی بات پر ہمارا منھ میٹھا کراؤ -

آپا :- تھوڑی سی شکر پھانک لو، مُنھ میٹھا ہو جائیگا

حمیدہ :- باتوں اور بہانوں سے کام نہیں چلے گا، آپاجان ! بہاری حلوائی کی دوکان سے گرم گرم امرتیاں منگوا کر کھلانی ہوں گی -

آپا :- مٹھائی تمھاری پکّی رہی، ذرا تمھارے دولھا بھائی آجائیں، پھر جس چیز کو کہو گی، منگا دی جائیگی

حمیدہ :- "آپاجان زندہ باد" --- مٹھائی تو آہی

جائے گی، دلی کی سیر کا تو حال سناؤ

آپا :— دلّی کی سیر کا حال ایک دو گھنٹہ میں بیان نہیں ہو سکتا، اس داستان کے لیئے تو کئی دن اور کئی راتیں چاہئیں۔

حمیدہ :— تھوڑا بہت حال تو اس وقت سُنا دیجئے۔

آپا :— اچھا لو اللہ کے گھر سے دِلّی کی سیر کا حال میں شروع کرتی ہوں۔ سُنو :—

دلّی شہر کی تمام پُرانی عمارتیں دیکھنے کے قابل ہیں جن میں لال قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ، جنتر منتر، حضرت نظام الدین کی درگاہ، قطب مینار، منصور کا مدرسہ اور جامع مسجد بہت زیادہ مشہور ہیں، جو آدمی بھی دلّی کی سیر کے لیئے جائے گا ان عمارتوں کو ضرور دیکھے گا، ہر عمارت اپنی جگہ نئی شان رکھتی ہے لیکن جامع مسجد کی کچھ اور ہی بات ہے۔

دلّی شہر میں جامع مسجد ایسی ہے جیسے

انگوٹھی میں نگینہ! یہ عمارت شہر کی ناک ہے، اُس کے دم سے دلّی کی بہت کچھ رونق اور شہرت ہے۔ دلّی میں جامع مسجد نہ ہوتی تو یہ بستی ننگی ننگی سی دکھائی دیتی۔ شام کے وقت سارے شہر کی رونق جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سمٹ کر آجاتی ہے، ایسی چہل پہل تو میں نے کہیں نہیں دیکھی۔

جامع مسجد کے آس پاس کی دوکانوں پر دُنیا جہان کی چیزیں بکتی ہیں، کپڑا، جُوتے، ٹوپیاں، موباف، سُرمہ، کھلونے، کتابیں، پرانے برتن، پُرانے کپڑے، پنجرے اور اُن کے ساتھ بُلبُلیں، قمریاں، شامائیں، مینائیں۔ بہت سے پرندوں کے تو میں نام بھی نہیں جانتی۔

حمیدہ:— تو یوں کہو جامع مسجد کے اِرد گرد پُورا بازار لگا رہتا ہے۔

آپا :۔ بازاروں میں تو ایسی چہل پہل کبھی نہیں ہوتی ۔ اور ہاں ! یہ سُن کر تمھارے منھ میں پانی بھر آئے گا کہ جامع مسجد کے پاس کی دوکانوں پر کباب، برف کی قفلیاں، فالودہ، دہی بڑے، تلی ہوئی مچھلیاں اور پراٹھے بھی بکتے ہیں۔ تمھارے دُولھا بھائی نے کباب مول لے کر کھلائے تھے، بس مزہ ہی تو آگیا اب تک زبان چٹخارے لے رہی ہے۔

لال قلعہ اور جامع مسجد آمنے سامنے ہیں، دونوں عمارتوں کے درمیان بہت بڑا میدان ہے۔ لال قلعہ سے جامع مسجد ایک ہزار گز کے فاصلہ پر ہے، قلعہ سے آدمی پیدل چل کر دس بارہ منٹ میں جامع مسجد پہونچ سکتا ہے۔ جامع مسجد پہاڑی پر بنائی گئی ہے مگر پہاڑی کے نشان کہیں نظر نہیں آتے، دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ بستی ڈال کر مسجد کی کرسی

اونچی کی گئی ہے۔

جامع مسجد کے تین دروازے ہیں، سب سے بڑے دروازے کا مُنہ لال قلعہ کی طرف ہے۔ اس دروازہ کی عمارت تو اور ہی چیز ہے میں تو اس کے پھاٹکوں کو بہت دیر تک دیکھتی رہی، اتنے خوب صورت مضبوط اور سڈّول پھاٹک میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ ہم نے مسجد میں پہنچتے ہی پہلے دو رکعت نماز پڑھی۔ (آپ نماز کے وقت پہنچی تھیں۔ آپا جان ۔! حمیدہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔) نہیں! نماز کا وقت تو نہ تھا مگر جو مسلمان مسجد میں داخل ہوتا ہے اُس پر لازم ہے کہ مسجد کا حق ادا کرے اور یہ حق دو رکعت نماز ہے۔

جامع مسجد کا صحن لال پتھر کا بنا ہوا چوکور ہے ایک وقت میں ہزاروں آدمی اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں، صحن کے تین طرف حُجرے بنے ہیں

جن سے مسجد کی خوشنمائی کو اور چار چاند لگ گئے۔ صحن کے بیچ میں سنگ مَرمَر کا بنا ہوا حوض ہے جس کے پانی سے نمازی وضو کرتے ہیں، یہ حوض بس وضو کے لیئے ہے کوئی اس میں کپڑے نہیں دھو سکتا اور نہ نہا سکتا ہے، حوض کا پانی بہت صاف سُتھرا رہتا ہے، مسجد کے ملازم حوض کی صفائی کراتے رہتے ہیں۔

مسجد کی عمارت لال پتھر کی بنی ہے، اونچی اونچی محرابوں اور لا بنے لا بنے دروں اور ستونوں کی تراش اور کٹاؤ دیکھنے سے جی نہیں بھرتا، کاریگروں نے پتھروں کو کانٹ چھانٹ کر کچھ ایسا خوب صورت بنا دیا ہے جیسے کوئی دم میں اب بولنے والے ہیں۔

سنگِ مَرمَر کی سپیدی اور سنگِ موسیٰ کی سیاہی سے جو پچی کاری ہوئی ہے اُس نے

تو مسجد کو سچ مچ دُلہن بنا دیا ہے۔ جہاں پیشِ امام صاحب کھڑے ہوکر نماز پڑھاتے ہیں وہ محراب سب سے زیادہ خوب صُورت ہے۔ محرابوں پر قرآن شریف کی آیتیں لکھی ہیں، سُنہری بیل کے ساتھ عربی لکھاوٹ کیا بہار دیتی ہے۔ مسجد کا ہے کو ہے کاری گری کی جیتی جاگتی کرامت ہے۔

حمیدہ! میں تو ایک ایک چیز کو دیکھ دیکھ کر دیوانی ہوئی جارہی تھی، کبھی دیواروں کو چھوتی، کبھی سنگ مَرمَر کی پچی کاری پر ہاتھ پھیرتی، کبھی قرآن شریف کی آیتوں کو پڑھتی، تمھارے دُولھا بھائی میری حالت دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میرا وہاں بہت دیر تک بیٹھنے کو جی چاہتا تھا لیکن بہت سے مرد مسجد دیکھ رہے تھے، بے پردگی کے ڈر سے ہم چلے آئے۔

پھر ہم مسجد کی مینار پر چڑھے، میری تو سانس پھول گئی اور دم چڑھنے لگا، کئی جگہ دم لے لے کر اور ٹھہر ٹھہر کر جیسے تیسے مینار کی چوٹی پر پہنچی مینار کی چوٹی سے جو ہم نے شہر کو دیکھا تو شہر کے مکان ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے دھوبی نے کپڑے دھوکر پھیلا دیئے ہیں، ساری دلی ہماری نگاہوں کے سامنے تھی۔ مینار کے پتھروں پر بیسیوں نام لکھے تھے، سیر کرنے والوں نے چاقو اور لوہے کی نکیلی چیزوں سے کھود کھود کر لکھائی کی تھی، میں نے تمھارے دولھا بھائی سے کہا کہ تم اپنا نام کیوں نہیں لکھ دیتے وہ بولے۔ یہ بہت بُری بات ہے، پُرانی عمارتوں کو اس صُورت سے خراب نہ کرنا چاہیئے، میناروں اور بُرجوں پر اس طرح نام لکھ دینے سے کسی کی شہرت بھی نہیں ہو جاتی۔ ایسی حرکتیں چھچورے

اور نادان لوگ کیا کرتے ہیں،

حمیدہ :— تمھیں اتنی اونچی مینار پر جاتے ہوئے ڈر نہیں لگا۔ آپا!

آپا :— ڈر لگنے کی کیا بات تھی، تم جس طرح اپنے گھر کے زینہ کی سیڑھیوں پر چڑھتی چلی جاتی ہو، بس اسی طرح میں بھی اوپر پہنچ گئی۔ ہاں! مینار پر چڑھ کر جو میں نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہوکر رہ گیا اور میں گھبرا کر سامنے کی طرف دیکھنے لگی۔

مینار پر چڑھتے اُترتے میں ہم تھک گئے تھے اس لیئے سستانے کے لیئے مسجد کے حجرے میں بیٹھ گئے، تمھارے دولھا بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ مسجد تو تم نے دیکھ لی، مگر تمھیں یہ بھی خبر ہے کہ یہ مسجد کس زمانہ میں بنی، کتنی لاگت آئی، کس کی نگرانی میں تیار ہوئی۔ میں نے کہا

21336

میں تم سے پوچھنے والی ہی تھی تم نے میرے مُنھ کی بات چھین لی۔

تمھارے دُولھا بھائی نے سمجھا بُجھا کر مجھے بتایا کہ شاہ جہاں بادشاہ کے حکم سے سنہ ۱۶۵۰ء میں اس مسجد کی بنیاد رکھی گئی، پورے چھ برس تک پانچ ہزار مزدور روزانہ کام کرتے رہے، سعداللہ خاں وزیر اور فاضل خاں خانساماں کی نگرانی میں کام ہوا، دس لاکھ روپیہ خرچ ہوئے، مگر اُس زمانہ کا روپیہ آج کل کے روپیہ سے قیمت میں بہت زیادہ تھا، مزدوری بھی بہت سستی تھی، آج تو ایک کروڑ روپے میں ایسی عمارت نہ بنے گی، اور کروڑ دو کروڑ روپیہ کوئی لگا بھی دے تو اُس زمانے کے کاریگر کہاں سے آئیں گے۔

تم جانتی ہو کہ تمھارے دولھا بھائی جب بولنے پر آتے ہیں تو بولے ہی جاتے ہیں رُکنے کا نام

نہیں لیتے، ذرا سی بات کو داستان بنا دیتے ہیں وہ بہت دیر تک مسجد پر لکچر دیتے رہے، مجھے جو کام کی باتیں یاد رہ گئی ہیں وہ میں تم سے ابھی کہہ چکی ہوں۔

ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ اذان کی آوازوں سے مسجد گونج گئی، کئی آدمی ایک ساتھ اذان دے رہے تھے، سچ جانو! حمیدہ! میرے دل پر اُس وقت کچھ ایسا اثر ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ اور محمدؐ کا نام جب اذان دینے والے پکارتے تو دل کانپ کانپ جاتا۔ میں نے جامع مسجد ہی میں عصر کی نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر دعا مانگی یا اللہ! اس مسجد کے بنانے والوں کی قبریں سدا ٹھنڈی رہیں اور تیرا نام اس مسجد کی میناروں سے قیامت تک بلند ہوتا رہے ——— آپا کی باتیں سُن کر حمیدہ کی پلکیں بھی آنسوؤں میں بھیگ گئیں۔

لال قلعہ

دلّی شہر کی قسمت کا ستارہ بھی سدا گھومتا رہا ہے، چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، دلّی بس بس کر اُجڑی اور اُجڑ اُجڑ کر بسی ہے، کتنی بہت سی بادشاہوں کے چراغ دلّی میں جلے اور بجھ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس بستی کی ایک ایک ٹھیکری تاریخ کی ایک کتاب ہے۔ زمانہ کے بہت سے اُلٹ پھیر اور اتار چڑھاؤ دلّی نے دیکھے ہیں۔

شاہ جہاں بادشاہ نے بھی اپنی بادشاہت کے

زمانہ میں دِلّی کو نئے طریقہ سے آباد کیا اور اس کا نام شاہ جہاں آباد رکھا، مگر اندر پرستھ اور تغلق آباد کی طرح شاہ جہاں کا رکھا ہوا نام بھی مشہور نہ ہو سکا اور دلّی کو لوگ دلّی ہی کہتے رہے۔

شاہ جہاں بادشاہ کو عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا، دلّی کا لال قلعہ، تاج بی بی کا روضہ، آگرے کے قلعہ کی بعض خوب صورت عمارتیں اور اجمیر کا اناساگر، شاہ جہاں کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں غیروں کی نہیں اپنوں ہی کی حکومت تھی، ملک کا پیسہ ملک ہی میں رہتا تھا، اس لیئے دولت کی کمی نہ تھی، عمارت بنانے والے بھی ایسے ایسے کاریگر موجود تھے کہ جن کی کاری گری پتھر میں جان ڈال دیتی۔

سنہ ۱۶۳۸ء میں شاہ جہاں نے قلعہ بننے کا
حکم دیا، استاد احمد جو عمارت بنانے کے فن
میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، لال قلعہ کے
بننے کا کام اُن کے سپرد ہوا۔ نو برس تک ہزاروں
مزدور اور کاری گر کام کرتے رہے دُور دُور سے
قلعہ کے لیئے پتھر آیا، لاکھوں روپیہ صرف ہوا تب
کہیں جاکر لال قلعہ کی عمارت تیار ہوئی۔ قلعہ
بننے کے بعد شاہ جہاں نے اس میں دربار کیا
اور کئی دن تک خوب دھوم دھام رہی۔

دلّی کا لال قلعہ چھ لاکھ گز زمین میں بنا ہوا
ہے اور آگرے کے قلعہ سے دوگنا ہے، اس
کے پورب میں جمنا ہے اور تینوں طرف خندق ہے،
بادشاہی زمانہ میں یہ خندق پانی سے بھری رہتی
تھی تاکہ کوئی دشمن بُرے ارادے سے آئے تو
خندق میں پانی ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ

قلعہ تک نہ پہنچ سکے۔ جس زمانہ میں قلعہ بنا تھا
اُس وقت جمنا قلعہ کے نیچے بہتی تھی اب وہ
دُور ہٹ گئی ہے، اور اُس پر انگریزوں نے
ریل کے آنے جانے کے لیئے لوہے کا پُل بنادیا
ہے جس پر دن رات ریل گاڑیاں بھک بھک
کرتی اور دھواں اُڑاتی رہتی ہیں۔

لال قلعہ کی چار دیواری سُرخ پتھر کی
بنی ہے اور دیکھنے میں بہت بھلی لگتی ہے،
چار دیواری کو دیکھ کر ہی دل کہتا ہے کہ جس عمارت
کی دیواریں ایسی ہیں تو اُس کے اندر نہ جانے کیا
ہوگا؟ قلعہ کا بڑا دروازہ بھی دیکھنے کے قابل ہے
منڈیروں کی اونچائی کو دیکھتے ہوئے سر کی
ٹوپی سنبھالنی پڑتی ہے۔

قلعہ کے اندر کی بہت عمارتیں انگریزوں نے
توڑ کر فوجوں کے لیئے بارکیں، گودام اور دفتر

بنا دیئے، اب تو نئی عمارتوں میں فوجی گور سے رہتے ہیں اور قلعہ میں موٹریں اور لاریاں دوڑتی پھرتی ہیں، مغل بادشاہوں کے زمانہ میں تو بڑے بڑے امیر اور وزیر سر جھکا کر اور ہاتھ باندھ کر قلعہ میں آتے تھے، مگر یہ دنیا ہے۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔

دیوانِ عام لال پتھر کا بنا ہے، اس عمارت کے ستون بہت خوب صورت ہیں بادشاہ سلامت دربار کے وقت اوپر جھروکے میں بیٹھتے اور درباری لوگ نیچے کھڑے رہتے، بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کا نام "دلنشیمن" ہے، جس کی دیواروں پر بھانت بھانت کے پرندوں کی رنگ رنگی تصویریں بنی ہیں۔ اس عمارت کو بنے تین سو سال ہو گئے مگر چڑیوں کی تصویروں کا رنگ پھیکا نہیں پڑا۔

دیوانِ خاص لال قلعہ کی سب سے زیادہ خوب صورت عمارت ہے، پوری عمارت سنگ مَرمَر کی بنی ہے، سنگ مَرمَر کو تراش کر جو محرابیں بنائی گئی ہیں اُن کے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا، دل میں آتا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیئے، ستونوں، محرابوں اور چھت پر سونے کا پانی پھرا ہے اور طرح طرح کے بیل بوٹے بنے ہیں، دیوانِ خاص میں سنگ مَرمَر کا چبوترہ ہے اس پر تخت طاؤس رکھا جاتا اور بادشاہ سلامت اس پر بیٹھ کر دربار کرتے۔

نہانے کے لیئے شاہی حمام کی عمارت بھی دیکھنے کے قابل ہے، حمام کے درجے ہیں، چھوٹے بڑے کئی حوض بنے ہیں، چھوٹے حوضوں میں شاید چھوٹے بچے نہاتے ہوں گے۔ اس حمام میں ٹھنڈے اور گرم پانی کا انتظام تھا اور حوضوں کا

پانی عطر اور پھُولوں کی خوشبو میں بسا رہتا۔ شاہی زمانہ میں تو یہاں پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا تھا اور اب تو جس نے دو آنہ کا ٹکٹ مول لیا، دیوانِ خاص اور حمّام میں کھٹام کھٹام کرتا جا پہنچا۔ دنیا کی دولت اور بادشاہت بھی دھوپ چھاؤں کی مانند ہے کہ ابھی سب کچھ ہے اور ذرا سی دیر میں کچھ بھی نہیں۔

لال قلعہ کی نہر جو دیوانِ خاص، موتی محل، بڑی بیٹھک اور رنگ محل میں ہوکر جاتی ہے۔ "نہر بہشت" کے نام سے مشہور ہے، اس نہر کا نام بھی کسی نے خوب رکھا ہے، لال قلعہ اس زمین پر بہشت ہی تو ہے، شاہی زمانہ میں نہر بہتی تھی، فوارے چلتے تھے اب تو پتھر ہی پتھر رہ گئے ہیں۔ قلعہ میں سنگ مَرمَر کی بنی ہوئی مسجد بھی بہت خوشنما ہے۔

لال قلعہ کی دو عمارتیں ساون بھادوں بھی بہت خوب ہیں، اب تو وہاں کے حوض سوکھے پڑے ہیں اور در و دیوار پر حسرت اور بے کسی برستی ہے۔ جب لال قلعہ میں بادشاہ رہتے تھے تو اس حوض میں نہر آکر گرتی تھی، اُس کے طاقوں میں چراغ جلتے تھے اور بالکل ساون بھادوں کی برسات کا سماں بندھ جاتا تھا، طاقوں کے چراغ جگنوؤں کی طرح چمکتے تھے، نہر کے گرتے ہوئے پانی پر مینھ کی رِم جھم کا دھوکا ہوتا تھا۔

لال قلعہ کا شاہی بُرج جو سنگ مَرمَر کا ہے دیکھنے والوں سے کہتا ہے کہ ایک دن وہ تھا کہ مجھ میں بادشاہ سلامت بیٹھا کرتے تھے، مخملین قالین اپنی بہار دکھاتے تھے، چوب داروں کی آواز سے قلعہ گونجتا تھا، رونق ہی رونق اور چہل پہل ہی چہل پہل تھی مگر

آج میرا سُہاگ لٹ گیا اور ؎
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

تاج محل

از کیسر کلاں، ضلع بلند شہر
۱۰ / اگست سنہ ۴۶ء

رشید بھائی!

تم دل ہی دل میں بُرا بھلا کہتے ہو گے کہ اس مسرور کے پاس ایک چھوڑ چار خط بھیج چکا ہوں مگر اُس نے اُلٹ کر ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ بھائی! تمھارا غصہ سر آنکھوں پر! لیکن میں نے جان کر ایسا نہیں کیا بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم

خط بھیجو اور میں جواب نہ دوں سچ جانو! تمھارا خط جب کبھی آجاتا ہے تو ہمارے سارے گھر میں عید ہوجاتی ہے، ادھر تمھارا خط آیا اور ادھر میں نے جواب لکھ دیا۔

جواب نہ دینے کی وجہ یہ ہوئی کہ میں بیس دن سے گھر پہ نہ تھا۔ ہمارے اسکول کی فٹ بال ٹیم باہر گئی تھی اور مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔ بہت سے اسکولوں کی ٹیموں سے ہماری ٹولی کا کھیل میں مقابلہ ہوا، بہت سی جگہ ہم جیتے اور کہیں کہیں ہار بھی گئے، جیت ہار تو زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے، ہر جگہ جیت نہیں ہوتی، کہیں ہار جانا بھی پڑتا ہے، لیکن ہمارے کھیل کی ہر شہر میں تعریف ہوئی اور متھرا میں تو ہماری وہ دھاک بیٹھی ہے کہ جس اسکول سے مقابلہ ہوا پیٹ کر رکھ دیا، آٹھ آٹھ گولوں سے ہرایا ہے وہاں کی ٹیموں کو!

یہ سفر بہت ہی دلچسپ رہا، تم ساتھ ہوتے تو مزہ اور دوبالا ہو جاتا، سچ جانو میں نے ہر جگہ تمھیں یاد کیا، خاص طور سے کان پور کی ایک دعوت میں تم بہت زیادہ یاد آئے، وہاں کے فٹ بال کلب نے ہماری ٹولی کو ایک خوشنما باغ میں شام کے وقت پارٹی دی تھی، تمھیں آئس کریم بہت پسند ہے اور اس پارٹی میں کئی کئی قسم کی آئس کریم تھی اور بہتات کے ساتھ تھی! میں اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ آج میرا دوست رشید ہوتا تو آئس کریم کا حق ادا کر دیتا۔

اس سفر کی داستان بہت لمبی ہے، ہر بات پھیلا کر بیان کروں تو تمھارے نام کا خط ایک کتاب ہو جائے گا اور تم پڑھتے پڑھتے گھبرا جاؤ گے، اس لئے میں سفر کی سب سے زیادہ دلچسپ

اور یادگار بات تمہاری دلچسپی کے لیئے لکھتا ہوں، رشید! ان آنکھوں نے وہ چیز دیکھی ہے کہ جس کے بار بار دیکھنے کی سدا تمنا رہے گی اور جسے نہ آنکھیں بھول سکتی ہیں اور نہ دل۔!

متھرا سے آگرے پہنچنے کے بعد چار پانچ دن تو ہم اسکولوں سے کھیلوں کے مقابلہ میں لگے رہے اور کہیں جا آ نہ سکے، بس بہت سے بہت اتنا کیا کہ بازار ہو آئے، کسی باغیچے کی سیر کرلی، شہر کی گلیوں میں گھومنے پھرنے کے لیئے نکل گئے، کھیل سے فارغ ہونے کے بعد، یار دوستوں نے کہا کہ آگرے آئے ہیں تو تاج محل ضرور دیکھیں گے، سات سمندر پار سے لوگ ہزاروں روپیہ خرچ کرکے تاج محل دیکھنے کے لیئے آتے ہیں اور ہم تو یہاں آہی گئے ہیں، تاج محل دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے چاہے اولے ہی کیوں نہ پڑتے ہوں۔

ہاں! تو اتوار کی شام کو ہم لوگ تانگوں میں بیٹھ کر تاج محل دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ آگرے شہر کی شہرت تو دُور دُور ہے مگر اُس کی گلیاں بہت تنگ ہیں اور بعض محلّوں میں تو بالکل گاؤں جیسے راستے اور گلیارے ہیں۔ لیکن جدھر تاج محل کی عمارت ہے، اُس طرف کا حصّہ بہت خوشنما ہے، چوڑی اور صاف سڑک ہرے بھرے درخت، قدم قدم پر ہریالی، بس یوں سمجھو کہ ہم باغوں میں ہوتے ہوئے تاج محل پہنچے۔ تاج محل کے دروازے پر تانگے، بگھیاں، موٹریں اور سائکلیں کھڑی تھیں، سیر کرنے والے آجا رہے تھے۔

رشید! میں تو تاج محل کے دروازے کو دیکھ کر ہی اچنبھے میں رہ گیا، سُرخ پتھر کا بہت اونچا اور خوشنما دروازہ، جس کی محرابوں کی خوبصورتی آنکھوں میں کھُبی جاتی تھی۔ میں حیران تھا

کہ یا اللہ! آج سے تین سو سال پہلے جب کہ سائنس کی نئی نئی چیزوں سے لوگ واقف نہ تھے، اتنے اتنے بھاری پتھر کس آلہ کے ذریعے اتنی اونچائی پر پہنچائے گئے ہوں گے۔ میں بہت دیر تک دروازے کو دیکھتا رہا، اس پر میرے کھیل کے ساتھی کرشن کمار نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مسرور! تم تو اس دروازے کو دیکھ کر ہی حیران ہو گئے، ارے بھائی! اندر چلو، تاج محل کی اصل عمارت چل کر دیکھو، تم تو ابھی سے بھوچکے ہوئے جا رہے ہو، مقبرے کے بیل بوٹے اور جالیاں دیکھ کر نہ جانے تمھارا کیا حال ہوگا۔"

اب ہم دروازے سے گزر کر صحن میں آئے صحن کاہے کو تھا شاہی قلعہ کا پائیں باغ تھا، ہریالی، پودے، پھولوں کی کیاریاں، خوشنما روشیں

ایک ایک چیز کو دیکھ کر دل لوٹ ہوا جاتا تھا۔ بیچ کے راستہ کے دونوں طرف سرو کے پودے کیا بہار دے رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باغ کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیئے سنتری کھڑے ہیں۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد سنگ مَرمَر کا حوض آگیا جس کا پانی موتی کی مانند جھلک رہا تھا۔ تاج محل اب ہماری آنکھوں کے سامنے تھا، سنگ مَرمَر کی سپیدی اور آرائش نمائی نگاہوں کا دامن پکڑ کر کھینچ رہی تھی کہ "بس ذرا قدم بڑھائے ہوئے چلے آؤ..." سنگ مرمر کے زینہ سے ہو کر ہم ایک اونچے چبوترے پر پہنچے جس کا پورا فرش سنگ مَرمَر کا تھا، اب ہم تاج بی بی کے روضہ کے سامنے کھڑے تھے۔ روضہ کی عمارت کیا بتاؤں کہ کیسی ہے؟ بس یوں سمجھو کہ سورج کی دھوپ، ستاروں کا اُجالا اور چاندنی ایک جگہ

سمٹ کر آگئی ہے۔ مَرمَر کے پتھروں کو ہوشیار کاریگروں نے اس صفائی کے ساتھ جوڑا ہے کہ کوئی کاغذوں کو بھی اس خوب صورتی سے نہیں جوڑ سکتا۔

اندر روضہ میں پہنچ کر تو رشید سچ جانو میری آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نیند میں ہوں اور خواب دیکھ رہا ہوں، دُنیا کے پردے پر ایسی عمارت کاہے کو ہوگی۔ کس کس چیز کی تعریف کروں اور میں تعریف کرنا بھی چاہوں تو اس کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں گا۔ کاریگروں نے تاج محل نہیں بنایا جادوگری کی ہے۔ پھُول پتیاں، بیل بوٹے، محرابیں، درودیوار گنبد، جالیاں غرض ایک ایک چیز اپنا جواب نہیں رکھتی۔ میں تو جالیوں کی باریکی اور پھُول پتیوں کی نزاکت اور خوش نمائی کو دیکھ دیکھ کر

جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ اس کے بنانے والے اسی زمین کے رہنے والے تھے یا آسمان سے اُتر کر آئے تھے کہ لاؤ دُنیا میں جنت کا ایک نمونہ بنا کر کھڑا کر دیں۔

میں نے جالیوں اور پھُول پتیوں کو صرف دیکھا ہی نہیں بار بار چھوا، جی میں آتا تھا کہ ایک ایک بیل بوٹے کو دل میں رکھ لوں۔ قرآن شریف کی آیتیں اس کمال کے ساتھ لکھی گئی ہیں کہ نیچے سے لے کر اوپر تک حرفوں کے دائرے ایک سے دکھائی دیتے ہیں، بال برابر فرق نظر نہیں آتا۔ شاہ جہاں بادشاہ اور ان کی چہیتی بیوی ممتاز محل دونوں کی قبریں برابر برابر ہیں، شاہ جہاں کو اپنی بیگم سے بہت زیادہ محبت تھی، اُسی کی یادگار میں بادشاہ نے یہ عمارت بنوائی تھی۔

ہمارے ماسٹر صاحب بتاتے تھے
کہ ۱۶۳۲ء میں تاج محل بننا شروع ہوا اور
۱۶۵۰ء سے کچھ پہلے کام ختم ہوگیا۔ اُستاد
عیسیٰ نے اس عجیب و غریب عمارت کا نقشہ
تیار کیا تھا، شاہی خزانہ سے کروڑوں روپیہ
اس پر صرف ہوا، ہزاروں مزدور اور کاری گر دن
رات کام میں لگے رہے جب کہیں جاکر یہ عمارت
تیار ہوئی، کہا جاتا ہے کہ دُنیا بھر میں سات عجیب
چیزیں ہیں جن میں سے ایک یہ تاج محل ہے۔
یوں ہونے کو دُنیا میں ہر طرح کی عمارتیں ہیں مگر
تاج محل جیسی عمارت کہیں نہیں ہے۔ یورپ
کے بڑے بڑے باکمال انجنیر تاج محل کو
دیکھ کر اچنبھے میں رہ جاتے ہیں، اس عمارت کو
بنے ہوئے تین سو سال ہوگئے، مگر ایسا معلوم
ہوتا ہے جیسے یہ عمارت آج ہی بنی ہے، خوبصورت

اور نازک عمارتیں پائدار نہیں ہوتیں لیکن تاج محل میں یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

روضہ کے باہر آس پاس سنگِ مرمر کا فرش ہے اور اس کے چاروں کونوں پر بہت اونچے مینارے ہیں، ہم بھی ایک مینار پر چڑھ گئے، تیس چالیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میری تو بھیا! سانس پھول گئی، بات یہ ہوئی کہ میں نے شروع شروع میں تیزی کے ساتھ چڑھنا شروع کیا اور اونچائی پر پہنچنے کے لئے آہستہ آہستہ پاؤں اٹھانے چاہئیں نہیں تو آدمی بہت جلد تھک جاتا ہے۔ سنگ مرمر کی اس اونچی برجی پر پہنچ کر ہم نے جمنا کی خوب سیر کی، دریا کی دھار پر کشتیاں چل رہی تھیں، دھوبی کنارے پر کپڑے دھو رہے تھے، کچھ لوگ نہا رہے تھے اور ایک سادھو کی کٹی پر ننگ دھڑنگ فقیر

بیٹھے ہوئے چلم پی رہے تھے۔

مینارے سے اُتر کر ہم نے مسجد دیکھی جو سُرخ پتھر کی بنی ہے اور بہت خوب صورت ہے، اسی مسجد کے جواب میں دوسری طرف تسبیح خانہ بنا ہے، یہ دونوں عمارتیں بالکل ایک ہی جیسی ہیں کہ ایک کو [illegible]لو اور دوسری کو چھپاؤ۔ مسجد کے صحن میں کبوتر گھوم رہے تھے، ہمیں آتا دیکھ کر کبوتر پھُر سے اُڑ گئے، یہ کبوتر بھی قسمت کے دھنی اور نصیبے کے بلند ہیں کہ تاج محل کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔

اب ہم تھک گئے تھے، سُستانے کے لئے درختوں کے نیچے ہریالی پر بیٹھ گئے، سقّے کٹورے بجاتے ہوئے گھوم رہے تھے، ایک سقّہ نے ہمیں پانی پلایا اور ٹھنڈا پانی پی کر ہم تازہ دم ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک باغ میں

گھومنے کے بعد تانگوں میں بیٹھ کر شہر چلے آئے۔ تاج محل سے آتے ہوئے میں پھر پھر کر اور لوٹ لوٹ کر روضہ کو دیکھ رہا تھا کہ نہ جانے زندگی میں پھر یہاں آنا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

رشید! تم نے تاج نہیں دیکھا تو دُنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔ یہ تمھارے یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے، اسکول کی چھٹیوں میں آگرے جاؤ اور اس عجیب و غریب عمارت کو دیکھو۔ ہندوستان کو تاج محل پر فخر ہے ہمارے ملک کی انگوٹھی کا یہ نگینہ ہے جس کی جوت اور چمک آج تک کم نہیں ہوئی۔

یہ لو! اماں جان کھانا کھانے کے

لئے آواز دے رہی ہیں، میں جا رہا ہوں،
رشید میاں کو رخصتی سلام — خدا حافظ۔

تمھارا دوست
مسرور

مطبوعہ
انتظامی پریس حیدرآباد دکن